اردو سفر نامہ اور دیارِ مغرب: سماج اور ثقافت کے چند رنگ

Urdu Travelogue and West: Colours of Culture and Society

زہرا ممتاز

ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان

Abstract

A befitting depiction of social life and cultural diversity of the people residing in the West has been made through the Urdu travelogues. The Urdu travelogues have presented such deeds, concepts, values, habit and customs of the West which have direct link with their social conscious and collective life. The article sheds life on theselect aspects of Western society and culture which have been portrayed by Urdu travelogues. They include Mustansir Husain Tarar, Syed Muhammad Kazim, Mehmoud Nizami, A.B Ashraf, Qamar Ali Abbasi and Salma Awan.

Keywords:Urdu Travelogue, Western Society and culture, Tarar, Kazim, Nizami

اردو سفر نامے میں دیارِ مغرب کے رہنے والوں کی سماجی زندگی اور ثقافتی رنگا رنگی کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔ اردو سفر نگاروں نے مسافروں کا ''بھیس'' بنا کر اہلِ مغرب کے ان اعمال وتصورات، اقدار و عادات اور عقائد و رسومات کا تماشا کیا ہے جن کا تعلق ان کے معاشرتی شعور اور اجتماعی زندگی سے ہے۔ ذیل میں مغربی سماج اور ثقافت کے چیدہ چیدہ رنگ پیش کیے جا رہے ہیں جنہیں اردو کے بعض اہم سفر نگاروں نے اپنی 'تصویرِ سیاحت' میں نمایاں کیا ہے۔

ایک سفر نگار جب کسی ملک کا سفر مدت قلیل میں کرتا ہے تو اسے وقت کی کمی کی وجہ سے اس ملک وقوم کی تاریخ اور تہذیب وثقافت کے مخصوص دریچے کھولنے کا موقع کم ہی ملتا ہے تاہم قمر علی عباسی نے جرمنی کی اس سیاحت کے دوران جن شہروں، علاقوں اور مقامات کی سیر کی، انہیں بیان کرنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ یہ کسی بھی ملک وقوم کی مخصوص اور مجموعی نفسیات ہے کہ قدرتی آفات اور جنگی حالات کے بعد وہ دنیا کے نقشے پر کس انداز سے ابھرتے ہیں۔ ان کے تعمیری راستے میں کون سا موڑ آئے گا۔ وہ قوم طرزِ کہن پہ اڑ جائے گی اور صرف محض اپنے اجداد کا ماتم ہی کرے گی یا پھر آئینِ نو کی تشکیل میں خود کو مصروف کرے گی۔ قمر علی عباسی نے جرمنی پر جنگوں کے اثرات کا جائزہ اپنے سفر نامے ''اور دیوار گر گئی'' میں جا بجا لیا ہے۔ جرمنی کے مفکر گوئٹے کے تباہ حال گھر کی تعمیرِ نو کا ذکر ان الفاظ میں

کرتے ہیں:

''تین سیڑھیاں اتر کر ایک کاری ڈور تھا اور پھر بائیں طرف لوہے کا گیٹ .....سرخ گلاب ہر شاخ میں لگے تھے لیکن مرجھائے ہوئے۔.....گلاب کے مرجھائے ہوئے پھولوں سے مل کر واپس آئے تو اندر دائیں طرف لکڑی کی سیڑھیاں تھیں، یہ گوئٹے کا گھر ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں اسے اتحادی فوجیوں نے گولہ باری سے مکمل تباہ کر دیا تھا۔ جرمنی والوں نے دوبارہ بنا دیا تا کہ ہم دیکھ سکیں۔''(۱)

قمر علی عباسی ایک ہی مضمون کو کئی رنگ میں بدلنے کا ہنر جانتے ہیں اور ان کا تہذیب وثقافت کا نیا رُخ بتانے کا انداز قاری کو بے لطف نہیں ہونے دیتا۔ جرمنی والوں کا دوسری عالمی جنگ کے بعد پرانی طرز پر ہی اپنی عمارتوں کی تعمیر کرنے میں کئی ایک پہلو مصنف نے بیان کئے ہیں۔ اپنی تہذیب وثقافت کو انہوں نے فراموش نہیں کیا اور نہ ہی سابقہ تلخ تجربات سے ان کی حوصلہ شکنی ہوئی ہے۔ جنگ کی تباہ کاریوں کے بعد جرمنی قوم نے جس طرح اپنی سماجی اور تمدنی زندگی کو از سر نو زندہ کیا ہے، وہ قابلِ تعریف ہے۔ یہ قوم جرأت مند ہے اور ماضی پرست بھی ہے، ساتھ ہی اپنے ملکی وقومی مفادات، تہذیبی وثقافتی معیارات کو بھی ملحوظ رکھتی ہے۔

ہر ملک وقوم کی تہذیب وثقافت کے کچھ اشارے کنائے ہوتے ہیں، کوئی نہ کوئی اسرار ورموز ہوتے ہیں، کچھ راز و نیاز ہوتے ہیں جسے مقامی لوگ ہی جانتے ہیں۔ اگر چہ غیر ملکی سیاح آتے جاتے ہیں لیکن ان کا ایک تجسس اور ''بے خبری'' قائم رہتی ہے، یوں ان ملکوں کی ثقافت کا بھرم برقرار رہتا ہے۔

مثال ملاحظہ ہو:

''ایگل نیسٹ کی پہلی منزل میں ہٹلر کی زندگی تصویروں میں دکھائی گئی.....ایک بات دل چسپ بات یہ ہے کہ تمام تصویروں کے نیچے جرمن زبان میں لکھا ہے تا کہ بات گھر کی گھر میں رہے۔ باہر کے سیاح ہٹلر کے بارے میں زیادہ نہ جان سکیں صرف تصویریں دیکھ کر تاثر قائم کریں۔''(۲)

جرمنی میں ہٹلر کے گھر کے اس عجائب گھر کی طرح بہت سے مقامات اور تاریخ کے اسرار ورموز ایسے ہیں جن کے استعاروں اور علامتوں کو یہاں کی عوام اور حکومت کے باہمی تعاون نے پس پردہ چھپا رکھا ہے۔ غیر ملکی سیاحوں کے لیے بھی ایک معمہ ہی رہتا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں اور قوموں کی اس خوبی کو مصنف نے بیان کیا ہے کہ وہ اپنے ملک کی تہذیب وثقافت کے صرف روشن پہلوؤں کو اس انداز میں اجاگر کرتے ہیں کہ تاریک پہلو دکھائی نہیں دیتے۔

قمر علی عباسی جرمن کے معروف مفکر گوئٹے، جس کی شخصیت سے علامہ اقبال بھی متاثر تھے، ان کی رہائش گاہ کے متعلق بتاتے ہیں:

''.....اسی لفٹ کا دروازہ کھلا اور میوزیم میں چلے گئے۔ اس میں خوبصورت سجے سجائے چودہ کمرے ہیں۔ یہ عام میوزیم نہیں ہے۔ اس میں گوئٹے کے دور کی عکاسی کی گئی ہے۔ گوئٹے کا خیال تھا، دنیا آرٹ اور کلچر کے تعبیر ادھوری ہے۔ اس لیے زندگی کو حسین اور خوش رنگ بنانے کے لئے شاعری اور مصوری اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ کمرے میں گوئٹے کے دور کی مصوری خوب صورت تصویریں تھیں پھر آرٹ کے نادر نمونے، تاریخی مصوری جن سے تاریخ کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس جگہ گوئٹے کی پورٹریٹ اور تصویریں ہیں۔ ایک کمرے میں لینڈ اسکیپ کے خوبصورت نمونے، سرسبز زمین گہرے نیلے آسمان اور سفید بادل باغوں میں رم جھم بارشیں، ان تصویروں کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا تھا، ہم ان رنگوں میں ڈوب رہے ہیں.....''(۳)

کسی قوم کی تہذیب و ثقافت کو سمجھنے کے لیے ان کے ماضی کا مطالعہ ضروری ہے۔ جرمن قوم اپنے ماضی سے محبت کرتی ہے اور اپنے اجداد کی نشانیوں کو محفوظ رکھتی ہے۔ یہ ایک زندہ قوم کی نشانی ہے۔

محمد کاظم نے بھی اپنے سفرنامے میں جرمن قوم کے مزاج اور نفسیات کے اس خاص پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے جس کا تعلق ترتیب، تنظیم اور تعمیر سے ہے۔ دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کے باوجود انہوں نے برباد شہروں کو آباد کیا اور تباہ حال عمارات اور مکانات کی دوبارہ تعمیر اور تنظیم کی۔ یہ بات مصنف کے لیے خاصی متاثر کن تھی۔ محمد کاظم تحریر کرتے ہیں:۔

''دوسری جنگ عظیم ننے ملک جرمنی کو آخر کار بالکل مسمار کر کے رکھ دیا۔ اس کا کوئی قابلِ ذکر شہر ایسا نہ تھا جو حلیف طاقتوں کی مجنونانہ بمباری کی زد میں نہ آیا ہو۔ ہستی بستی آبادیاں پتھروں اور اینٹوں کا ڈھیر بن گئیں..... جنگ کو ختم ہوئے ابھی سات آٹھ برس ہی ہوئے ہوں گے کہ وہاں سے ہو کر آنے والے لوگوں کی زبانی ہم سننے لگے کہ اہلِ جرمن نے اپنا گرا ہوا مکان پھر سے کھڑا بھی کر لیا.....۵۵۔۵۶ء پہنچتے پہنچتے جرمنی کا (اب اسے مغربی جرمنی کہنا چاہیے) ہیولی ہی بدل گیا تھا اور بہت سے شہروں میں تو یوں لگتا تھا جیسے ان پر آسمان سے بھی کوئی آفت ٹوٹی ہی نہ تھی۔ یہ ایک رخ تھا جرمنی کے کرداروں کا.....جس میں قوتِ صلابت تھی، جارحیت اور وحشی پن تھا اور اس کے ساتھ ایک مشین کی سی تنظیم اور کارکردگی تھی.....''(۴)

''مغربی جرمنی میں ایک برس'' کے مصنف کو دوران تعلیم مختلف مقامات کی سیر بھی کرائی گئی لہٰذا انہوں نے ان گرجا گھروں، مرغزاروں اور مختلف علاقوں کی منظر کشی کرتے ہوئے جرمن کی موجودہ تہذیب کو ماضی کے پردے میں دکھانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

''اس ''آ وَس فلوگ'' میں ہماری دوسری منزل ایک متوقع (modest) سی آبادی رابندن تھی۔ یہاں ہمیں پندرہویں صدی کا ایک گرجا دیکھنا تھا۔ اس گرجے میں داخل ہونے کے لیے ہم ایک قبرستان میں سے گزر کر گئے.....اس گرجے کی خاص چیز اس کی قربان گاہ (Altar) تھی جو فن چوب کاری (wood caring) کے بدائع میں شمار ہوتی ہے.....رابندر کا یہ گرجا جس میں ہم اس وقت بھیڑ بکریوں کی طرح آوارہ پھرتے تھے اس کی دوسری خصوصیت ہمیں یہ بتلائی گئی کہ اس میں مقدس یعقوب کی شبیہہ موجود ہے۔ مقدس یعقوب اور ان کے بھائی یوحنا دونوں حضرت مسیح کے ہمعصر تھے۔''(۵)

محمد کاظم کی جرمنی کی اس سیاحت کا ذکر ''نقدِ سفر'' میں یوں کیا گیا ہے:

''محمد کاظم جرمنی میں قیام کے دوران ہمیشہ گوش برآواز رہے ہیں۔ ان کی سماعت ہر لحظہ آواز پا کی منتظر رہی ہے یا انہوں نے اپنی صدائے دل پر کان لگائے رکھے ہیں تاہم فرصت کے لمحوں میں وہ موسیقی سے بہرہ یاب ہوئے ہیں۔ اس طرح قدیم قلعوں، گرجوں اور قبرستانوں کا نظارہ کرتے ہوئے انہوں نے گزرے زمانوں کے قدموں کی چاپ سننے کی کوشش کی ہے جس سے سفرنامے میں تاریخی جہت پیدا ہوئی ہے۔ سنگ وحشت کے قدیم مظاہر میں انہیں معماروں کے دلوں کی دھڑکن سنائی دیتی ہے جسے وہ غنائیت کے ساتھ صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیتے ہیں۔''(۶)

دوسری عالمی جنگ کے بعد کے اثرات نا صرف جرمنی قوم بلکہ تمام ترقی یافتہ یورپی ممالک میں ایک جیسے ہی مرتب ہوئے۔ اس کا اظہار محمود نظامی اس طرح کرتے ہیں:

''.....گویا بیس برس میں یہاں کوئی ایسا حادثہ، کوئی ایسا ہنگامہ نہیں ہوا جس سے اس کی ہیئت یا حلیہ بدل سکتا ہے۔ گلیاں اور کوچے، بازار اور سڑکیں، مکانات اور عمارتیں، محلات اور حویلیاں بالکل وہیں اسی طرح کھڑی تھیں جہاں جس طرح میں نے انہیں چھوڑا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ جرمن ہوا بازوں کی بمباری سے جو غارت گری لندن میں چار پانچ برس تک متواتر ہوتی رہی تھی اس کے آثار آج کہاں تھے.....میرے اس تجسس پر لندن مسکرا رہا تھا اور اس کے بازاروں اور گلیوں کی رونق زبانِ حال سے کہہ رہی تھی کہ اگر کوئی قوم زندہ رہنے کا عزم رکھتی ہے تو ابتدا کے ریلے اس کے حواس کو مختل نہیں کر سکتے.....''(۷)

دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کے بعد انگریز قوم نے جس طرح بحالی اور آبادکاری کی وہ قابل تعریف ہے۔ محمود نظامی نے ان کے اس قومی اور سماجی رویے کی خاص طور پر تعریف کی ہے۔

کسی بھی قوم کا مستقبل اس قوم کے بچے ہوتے ہیں۔ بچپن کی تربیت ان کی تمام عمر کی بنیادیں بناتے ہیں اور یہی تربیت ان کی مستقبل کا زینہ بنتی ہے۔ بچوں کی عادات وطوار سے ان کے مستقبل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ محمود نظامی بھی اپنی تصنیف ''نظر نامہ'' میں لندن کے سیاحت کے دوران لندن کے بچوں کی تربیت کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

> ''.....انگریز اوائل عمر ہی سے تنہائی اور کم گوئی کے اصولوں سے مانوس ہو جاتا ہے۔ جب وہ بچہ ہی ہوتا ہے تو وہ ماں کے سامنے گدے پر لیٹا یا گاڑی میں پڑا ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے۔ آنے جانے والوں میں سے کوئی اس کے بالوں کے رنگ، آنکھوں کی چمک، اعضاء کے تناسب کی بات نہیں کرتا۔ دوسرے ملکوں میں اگر بچے کے ساتھ سڑک پر چلیں تو بعض لوگ مسکرا کر اس سے ایک سوال بھی کر ڈالیں گے اور ہمارے ہاں تو ایک بہت بڑی آبادی کے لیے بچے کے کلے کھینچنا اور پیار سے اسے گالی دینا ایک اضطراری فعل کی حیثیت رکھتا ہے۔ انگلستان میں بچے کی حیثیت ایک فرد کی ہوتی ہے اور اس حیثیت میں اس کے حقوق بڑی حد تک وہی ہوتے ہیں جو بڑوں کو حاصل ہیں..... یوں بچہ طفولیت کے گوشے میں اطمینان کے ساتھ بڑھتا ہے۔''(۸)

محمود نظامی نے انگلستان کے سماج اور معاشرے کو سمجھنے کی خوب کوشش کی ہے اور یہ نتیجہ نکالنے میں کامیاب رہے ہیں کہ انگلستان میں زمانہ طفلی ہی سے باقاعدہ تربیت کا آغاز ہو جاتا ہے اور اس عمل میں پورا سماج شریک ہوتا ہے۔ ایک بچے کو بھی ''طفلِ سادہ'' خیال نہیں کیا جاتا بلکہ ''ایک فرد'' کے طور پر اس کا خیال رکھا جاتا ہے۔

کسی بھی قوم کے تاریخی حالات وواقعات اس کے سماجی اور ثقافتی رویوں اور رنگوں کا یقین کرتے ہیں۔ محمود نظامی نے تاریخ کے پس منظر میں فرانس کی معاشرت اور ثقافت پر نگاہ ڈالی ہے۔ محمود نظامی اپنے سفری احوال کو ڈرامائی انداز میں بیان کرتے ہیں اور اس طرح کسی ملک کے سماج اور ثقافت کی تصویریں تخیل کی سکرین پر دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اہلِ فرانس کے متعلق عمومی یہ رائے دی جاتی ہے کہ یہ لوگ غرور وتکبر، وطن پرستی اور عیش پرستی کے دل دادہ ہیں۔ ''نظر نامہ'' کے مصنف کا بھی ابتداء میں یہی خیال تھا لیکن فرانسیسیوں کے ساتھ کچھ عرصہ گزارنے کے بعد رائے دیتے ہیں کہ

> ''مہینہ بھران سے روزانہ ملنے کے بعد میرا تجربہ آج یہ تھا کہ یہ لوگ سب کے سب حد درجہ وطن پرست، محنت شعار، علم دوست، خوش اخلاق، شائستہ مذاق اور اکثر حالتوں میں نہایت فراح حوصلہ اور فیاض واقع ہوئے تھے۔ وہ نہ صرف ذہین تھے بلکہ ذہانت کے بہت دلدادہ بھی۔ دوسروں کی انفرادیت کے قدردان بھی.....ان میں سے اکثر لوگ اپنی منفرد رائے، اپنی خودی اور انانیت کے باعث آسانی سے دوسرے کی رائے کو اپنے پر حاوی نہیں ہونے دیتے تھے۔''(۹)

محمود نظامی نے فرانس کے نظامِ حیات کے مختلف پہلوؤں کو دلچسپی اور توجہ سے دیکھا ہے۔ فرانس کے خاندانی نظام کی تصویر کشی اس طرح کرتے ہیں:

''......ہماری طرح ان کے ہاں بھی کنبے کا احساس کسی قدر گہرا ہوتا ہے۔چین کی مانند فرانس بھی کنبوں ہی کے ایسے اجتماع کا دوسرا نام ہے جہاں ہر شخص اپنے گھرانے کے ارکان کے ساتھ بڑے گہرے تعلق کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ پچھلے روز یونسکو ریڈیو نے ویژن کے افسر اعلیٰ گارڈن فریزر کی میز پر ایک ہی مضمون پر مشتمل مختلف لوگوں کے بھیجے ہوئے تقریبی کارڈ دیکھ کر مجھے پتہ چلا تھا کہ اگر کوئی شخص کسی متمول فرانسیسی کنبے سے آشنائی رکھتا ہو تو اس کنبے کے کسی معمر رکن کی موت پر ایسے چھوٹے بڑے سب رشتہ داروں کی طرف سے چچا پئیر یا خامہ رین کی وفات حسرت آیات کی اطلاع فرداً فرداً آتی ہے اور مجھے مسٹر فریزر کے الفاظ یاد آئے کہ جب انگریز یا کوئی دوسرا مغربی اپنے کنبے کا ذکر کرتا ہے تو اس کا مطلب اپنی بیوی اور بچوں سے ہوتا ہے لیکن فرانس میں کنبے سے مراد ہوتی ہے۔ بیوی اور بچے، ماں اور باپ، بھائی اور بہنیں، ماموں اور چچا، خالائیں اور پھوپھیاں، بہنوئی اور بھاوجیں یعنی پورا ددھیال اور پورا ننھیال۔''(۱۰)

گویا اہلِ مشرق کی طرح اہلِ فرانس کا خاندانی نظام بھی وسعت کا حامل ہے۔ یہ محض دو تین افراد کے مجموعے کے نام نہیں بلکہ اس میں متعدد خونی رشتے ہیں۔محمود نظامی کا سفر نامہ ''نظر نامہ'' اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ مصنف نے سماج اور ثقافت کو شعور کی نظر سے دیکھا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کو فرانس میں کچھ زیادہ پذیرائی نہ مل سکی اور وہ یہاں کے ماحول میں خود کو اجنبی محسوس کرنے لگے:

''پیرس اور میں ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہ تھے، مگر ہمارے درمیان دوستی کی بنیادیں کبھی بھی گہری نہ ہو سکیں...... مجھے ہمیشہ یہاں آ کر گھٹن اور تنہائی کا احساس ہوا۔سیاحوں کی بھرمار، مقامی لوگوں کی سرد مہری اور حد درجہ مہنگائی ایسے عناصر ہیں جو مجھ جیسے آزادی پسند سیاح کی روح کا گلا گھونٹ کے رکھ دیتے ہیں۔''(۱۱)

پیرس کی عوام قوم پرست ہے اور وہ اپنی زبان سے محبت کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ پیرس میں اپنی ''بے زبانی'' کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''پہلی مرتبہ پیرس آیا تو......میں کئی روز اس کی گلیوں اور بازاروں میں گھومتا رہا لیکن کسی فرانسیسی نے مجھ سے بات تک کرنی گوارا نہ کی۔اول تو انگریزی سمجھتے نہیں اور بالفرض محال دو لفظ آتے بھی

ہوں تو منھ پر نہیں لاتے.....'' (۱۲)

سلمٰی اعوان نے اٹلی کو ایک خاتون کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ان کا انداز نظر مختلف ہے۔سلمٰی اعوان نے کوشش کی ہے کہ سماج اور معاشرے کے اہم زاویوں پر روشنی ڈالی جائے تاہم انھوں نے مجموعی معاملات کو بھی اہمیت دی ہے مثلاً روزگار کا معاملہ! یورپ کے سماج کا یہ مثبت پہلو ہے کہ یہاں بے روزگار ہونے کی صورت میں علاج معالجہ سکول فیس وغیرہ کے اخراجات سب ریاست کی ذمہ داری ہے۔جس کی مصنفہ نے کھل کر تعریف کی ہے۔

اٹلی کی انتشار پذیر تہذیب کے متعلق سلمٰی اعوان کا کہنا ہے:

''خاندان، مذہب اور کھانا اٹلی کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے تین پہلو جو کبھی بہت اہم تھے۔ اب مذہب اور خاندان کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔کھانے باقی رہ گئے ہیں۔'' (۱۳)

اٹلی کی سماجی اور ثقافتی زندگی کے دو اہم ستون مذہب اور خاندانی نظام زوال کا شکار ہیں، صرف مادی انسان باقی رہ گیا ہے۔

سفر نامہ ''ہوس سیر تماشا'' کے مصنف اے بی اشرف آسٹریا کے نظام زندگی کا خلاصہ یوں بیان کرتے ہیں:

''آسٹریا کا نظام، صفائی ستھرائی، اسلوب زیست، حسن و ذوق، طور طریقے، ڈسپلن، ترتیب و تنظیم دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آسٹرین ایک مہذب قوم ہے۔'' (۱۴)

مصنف آسٹریا کے نظام زندگی کا ایک اور پہلو دکھاتے ہیں:

''سارے یورپ میں سائیکلیں چلانے کا بہت رواج ہے۔سائیکلنگ کے لیے الگ سے ٹریک بنائے گئے ہیں۔بعض ٹورسٹ اپنی گاڑیوں کے ساتھ سائیکلیں بھی باندھے ہوئے ہوتے ہیں تاکہ ان کی معمول کی ورزش میں فرق نہ آئے۔'' (۱۵)

ڈاکٹر اے بی اشرف نے یورپی اقوام کی موجودہ ترقی یافتہ دور میں سائیکل کی مقبولیت اور فوائد کو محسوس کیا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفر نامے میں جہاں آسٹریلیا کے تفریحی مقامات کا ذکر ہے وہاں آسٹریلیا کے کلچر کی جھلکیاں بھی دکھائی گئی ہیں۔مصنف نے وہاں کے معاشرے کی بعض اہم تصاویر بھی پیش کی ہیں:

''مجھے یہاں آسٹریلوی معاشرے کی فراخ دلی اور بالغ نظری کا اقرار ہے..... سب نے بلاتخصیص آسٹریلیا کے لوگوں کے حسن اخلاق اور برتاؤ کی توصیف کی۔کسی ایک نے بھی شکایت نہ کی..... سب نے بے دریغ کہا کہ یہ لوگ مددگار ہیں، تعصب نہیں رکھتے، ہمیں حقیر نہیں

جانتے.....''(۱۶)

دیگر سیاحوں کی طرح مستنصر حسین تارڑ نے بھی آسٹریلوی قوم کی مجموعی اخلاقی قدروں کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

ہالینڈ میں مستنصر حسین تارڑ کو ایک خاموش اور صاف وشفاف عمارت دکھائی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے:

''تارڑ صاحب یہ بوڑھے جانوروں کا ہوم ہے.....جیسے اولڈ پیپل ہوتے ہیں..... یہاں لاچار ہو چکے عمر رسیدہ جانور،.....گدھے، گھوڑے، خچر، بلیاں وغیرہ اپنی عمر کے آخری ایام اطمینان سے آسودگی سے بسر کرتے ہیں.....انہیں اپنے جانوروں کا بھی اتنا خیال ہے اور عراق اور افغانستان میں ہلاک ہونے والے بچوں کا کچھ نہیں.....شاید کہتا جاتا تھا اور اس کے لہجے میں آزردگی تھی.....''(۱۷)

یہ پیراگراف پڑھ کر آنکھوں میں نمی آ جاتی ہے کہ مغرب میں جانوروں کا اتنا خیال رکھا جاتا ہے لیکن عراق اور افغانستان کے بچے اس سلوک سے محروم ہیں۔ یہ بات مغرب کی منافقت اور ظاہری انسان دوستی کو ثابت کرتی ہے۔

اردو سفرنامے میں مغرب کے سماج اور ثقافت کے متعدد پہلو بیان ہوئے ہیں۔ان میں جہاں بہت سے روشن پہلو ہیں وہاں بعض تاریک پہلوؤں کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ یہ امر اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے کہ سفرناموں کے ذریعے کسی ملک کا سماجی اور ثقافتی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

حواشی:

۱۔ قمر علی عباسی،اور دیوار گر گئی (کراچی: ویلکم بک پورٹ لمیٹڈ،۲۰۰۳ء)،ص۱۸۔

۲۔ ایضاً،ص۱۱۷۔

۳۔ ایضاً،ص۲۴-۲۳۔

۴۔ محمد کاظم،مغربی جرمنی میں ایک برس (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء)،ص۲۲-۲۱

۵۔ ایضاً ص۱۶۴-۱۶۵

۶۔ وحیدالرحمٰن خان،ڈاکٹر،نقد سفر (لاہور: بک ہوم،۲۰۱۴ء)،ص۶۴۔

۷۔ محمود نظامی،نظر نامہ (لاہور: الحمد پبلی کیشنز،۲۰۱۲ء)،ص۱۵۳۔

۸۔ ایضاً،ص۱۵۹۔

۹۔ ایضاً،ص۲۱۰۔

۱۰۔ ایضاً،ص۲۱۱۔

۱۱۔ تارڑ،مستنصرحسین،نکلے تیری تلاش میں(لاہور:سنگ میل پبل کیشنز،۲۰۱۶)،ص۳۳۳۔

۱۲۔ ایضاً،ص۳۳۳۔

۱۳۔ سلمٰی اعوان،اٹلی ہے دیکھنے کی چیز۔اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء،ص۲۵۔

۱۴۔ اے۔بی اشرف،ڈاکٹر،ہوسِ سیرِ تماشا(لاہور:جمہوری پبلی کیشنز،۲۰۱۶ء)،ص۵۷۔

۱۵۔ ایضاً،ص۵۲۔

۱۶۔ مستنصرحسین تارڑ، آسٹریلیا آوارگی(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۵ء)،ص۴۰۔

۱۷۔ تارڑ،مستنصرحسین،ہیلو ہالینڈ (لاہور:سنگ میل پبلشرز،۲۰۱۱ء)،ص۲۱۸۔

مآخذ

اے۔بی اشرف،ڈاکٹر۔ہوسِ سیرِ تماشا۔لاہور:جمہوری پبلی کیشنز،۲۰۱۶ء۔

تارڑ،مستنصرحسین۔ آسٹریلیا آوارگی۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۵ء۔

تارڑ،مستنصرحسین۔نکلے تیری تلاش میں۔لاہور:سنگ میل پبل کیشنز،۲۰۱۶۔

تارڑ،مستنصرحسین۔ہیلو ہالینڈ ۔لاہور:سنگ میل پبلشرز،۲۰۱۱ء۔

سلمٰی اعوان۔اٹلی ہے دیکھنے کی چیز۔اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء۔

قمرعلی عباسی۔اور دیوار گر گئی۔کراچی:ویلکم بک پورٹ لمیٹڈ،۲۰۰۳ء۔

محمد کاظم۔مغربی جرمنی میں ایک برس۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء۔

محمود نظامی۔ نظرنامہ ۔لاہور:الحمد پبلی کیشنز،۲۰۱۲ء۔

وحیدالرحمٰن خان،ڈاکٹر۔نقد سفر۔لاہور: بک ہوم،۲۰۱۴ء۔